عصری اسلامی اسکولوں میں ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں؟

(ہر کتاب کو اسی زاویے سے دیکھئے) (پہلی قسط)

ڈاکٹر سید خالد جامعی

یہ ۲۰۱۱ء کی بات ہے، ہمارے عزیز دوست عمیر ثانی ایک بین الاقوامی ادارے ''Trade Key'' کے شعبہ کمپیوٹر میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور جدید دنیا سے بخوبی واقف۔ ایک دن انہوں نے اپنے بچے کی تعلیم و تربیت سے متعلق بعض استفسارات کیے اور بچے کے بدلتے ہوئے رجحانات، نت نئے میلانات کے بارے میں سوالات اٹھائے، جو پری نرسری میں پڑھ رہا تھا۔ راقم نے عرض کیا: آپ کا بچہ کہاں پڑھتا ہے؟ معلوم ہوا کراچی کے سب سے بہترین اور مہنگے ترین اسلامی اسکول ''Generation'' میں پڑھتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ اسکول چند مہینوں بعد یونیورسٹی میں تبدیل ہونے والا ہے، عملے کا تقرر ہو چکا ہے۔

''جنریشن اسکول'' کی نگران ڈاکٹر غزالہ صدیقی صاحبہ نہایت نیک سیرت، متحرک، مؤثر، مخلص اور راسخ العقیدہ مسلمان خاتون ہیں۔ ان کے شوہر عرفان صدیقی میزان بینک کے چیف ایگزیکٹیو ہیں۔ جنریشن اسکول میں اسلامی اقدار، روایات، حجاب، حیاء کا خاص خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم نے عمیر ثانی صاحب سے کہا کہ آپ کا بچہ جو انگریزی کتابیں پڑھتا ہے، وہ لے آیئے۔ عمیر صاحب دوسرے دن کتابیں لے آئے، آکسفرڈ کی شائع کردہ ان کتابوں کا راقم نے ناقدانہ جائزہ لیا اور یہ جائزہ عمیر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ عمیر صاحب نے اگلے ہفتے اپنے بچے کا داخلہ منسوخ کرا دیا۔

یہ جائزہ ''جنریشن اسکول'' کے اساتذہ کی خدمت میں بھی تفکر، تدبر اور تنقید کے لیے پیش کیا گیا، جن کا جواب صرف یہ تھا کہ ہم نے تو ان کتابوں کا کبھی اس طرح جائزہ نہیں لیا، نہ ان کتابوں کو اس قدر گہرائی سے دیکھا ہے۔ اساتذہ خود حیرت اور تعجب میں مبتلا تھے۔ ۲۰۱۴ میں ہمارے ایک دوست جو ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈائریکٹر فنانس کے عہدے پر فائز ہیں اور ان کا بچہ بھی ''جنریشن اسکول'' میں پڑھتا ہے، ہمیں بتایا کہ ان کا بچہ بہت اداس اور افسردہ ہے، وہ پوچھتا ہے کہ ابو ہمارے گھر میں سب کچھ ہے، مگر سوئمنگ پول (تیراکی کا حوض) کیوں نہیں ہے؟ بچے کے گھر

میں دنیا کی ہر نعمت ہے، صرف پانی کا حوض نہیں ہے، تو اسے اپنا گھر حقیر نظر آتا ہے۔ ''ھل من مزید'' کا یہ طرزِ فکر، یہ احساس محرومی، بے بسی و بے کسی کا یہ اسلوب کس نے پیدا کیا؟

جدیدیت ''Modrenism'' کے پیدا کردہ معیارِ زندگی اور اس معیار میں مسلسل و مستقل اضافہ کا اصول ایک معصوم بچے کو بھی نفس مطمئنہ سے محروم کر دیتا ہے۔ اس مسئلے کی بنیاد تلاش کرنے کے لیے ہم نے اپنے دوست کی خدمت میں تین سالہ پرانا تجزیہ پیش کیا۔ یہ تجزیہ ایک آئینہ ہے جس میں بہت سے مخلص، راسخ العقیدہ، متقی، پرہیزگار لوگوں کے قائم کردہ اسلامی اسکولوں کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ تصویر جیسی بھی ہو اُسے غور سے دیکھئے! آئینے کو توڑنے کی کوشش نہ کیجیے، صرف اس تصویر کو بدلنے کی کوشش کیجیے جو ہماری خواہش، آرزو، جستجو کے بغیر نادانستہ طور پر ہمارے آئینے نے تخلیق کر دی ہے۔ صرف ایک سوال پر مسلسل غور کرنے کی ضرورت ہے، کیا اس تصویر کو بدلا جاسکتا ہے؟

ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ جدید تعلیمی ادارے ہماری تاریخ نے تخلیق نہیں کیے، یہ ہم پر مسلط کیے گئے ہیں، اس نظام کو فی الحال بدلنا ممکن نہیں ہے اور ریاستی قوت کے بغیر اس کا فوری متبادل پیش کرنا بھی اس وقت ممکن نہیں، لہٰذا ہم حالت اضطرار میں ہیں۔ لیکن لمحۂ موجود میں امریکہ، کینیڈا میں جدید اسکولوں کا متبادل ''گھر اسکول''، ''امی اسکول'' اور ''ابو اسکول'' /Home School/ Mom School Dad School وجود میں آچکے ہیں۔ دنیا کی تیئس تہذیبوں کی طرح گھروں، بستیوں، محلوں میں قائم یہ غیر تجارتی ''Non Commercial'' مکتب جو ہمارے شاندار ماضی کی یادگار ہیں، مغرب کے موجودہ نظام تعلیم کے لیے موجودہ سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں سے بہت اچھے، سستے اور بہت بہتر طلبہ تیار کر رہے ہیں، جو اخلاقی طور پر اور صلاحیتوں کے اعتبار سے بہت برتر ہیں۔ یہ اسکول ماں باپ نے خود اپنی مدد آپ کے تحت قائم کیے ہیں، کیونکہ صرف مادی کامیابی کے لیے تخلیق کیے گئے جدید اسکول مغرب کے بچوں کی مادی ضروریات بھی پوری کرنے سے قاصر ہیں اور بے شمار سنگین مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ مکتب قائم کرنے والے بہت مذہبی لوگ بھی نہیں ہیں، ان کا مقصد بچوں کی اخلاقی، روحانی، ایمانی، نورانی تربیت بھی نہیں ہے، محض مادی احساسِ زیاں یعنی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کی خواہش، آرزو اور جستجو نے ان کو ایک نئے تجربے اور متبادل نظام پر آمادہ کیا اور وہ صرف مادی طور پر کامیاب ہو گئے۔ اس خالص مادی ترقیاتی تجربے کو ہم ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر کے ایک سوال اٹھاتے ہیں: کیا جدید سیکولر تعلیمی اداروں میں اصلاحی، دفاعی اور انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے ان اداروں کی بنیادوں اور مرتبہ نصاب میں موجود زہر کا علاج ممکن ہے یا نہیں؟ ان میں اصلاح کا کتنا امکان ہے؟ یہ ہمارے سوچنے کا اصل میدان ہے۔

مغرب کے تمام ممالک جو سرمایہ دارانہ نظام کے نظریات: لبرل ازم، سوشلزم اور سوشل ویلفیئر ازم

پر یقین رکھتے ہیں، ان کا اجماع اصولاً آزادیِ مساواتِ ترقی کے عقائد پر ہے۔ یہ خدا، نبی، آخرت وغیرہ کے قائل نہیں۔ ان کا نظامِ تعلیم بھی انہی عقائد کے مطابق بچوں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ تعلیم کا مقصد محض ترقی، لذتوں کا حصول، آزادی اور معیارِ زندگی میں مسلسل ومستقل اضافہ ہے۔ اس کے باوجود ایک مغربی سوشلسٹ ملک نے اسی مفاد پرست، حاسد، حریص تعلیمی نظام میں چند بنیادی اصلاحات، چند ترمیمات اور اضافوں کے ذریعے ڈاکٹر بننے والوں میں حرص وحسد اور ہوس کے جذبات پیدا کرنے کی بجائے قوم پرستی اور انسان پرستی کے ذریعے خدمتِ خلق کا ایسا جذبہ پیدا کیا ہے جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑے طبی مشن اس ملک کے ڈاکٹروں اور طبی عملے پر مشتمل ہیں، جو مختلف غریب کمزور ممالک میں بلا معاوضہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بیک وقت چھپن ہزار لوگ اس عمل میں شریک ہیں، مگر ان میں سے ایک بھی کسی دوسرے ملک کی شہریت قبول نہیں کرتا، جبکہ اس ملک میں ڈاکٹروں کی تنخواہیں بہت کم بلکہ دنیا میں سب سے کم ہیں۔ تفصیلات کے لیے نوم چومسکی کی کتاب ''Profit over people'' کا مطالعہ کیجیے۔ بڑے بڑے عالمی ادارے: ''UNO، UNICEF، WHO، OXfam، ریڈ کراس'' بھی اربوں کھربوں روپے کے فنڈ وصول کرنے کے باوجود اتنے بڑے پیمانے پر مفت طبی امداد فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔

کفار اگر کفر کے نظامِ تعلیم میں تجربات کے ذریعے کچھ اصلاحات کر سکتے ہیں تو امتِ مسلمہ جو پندرہ سو سال کی تاریخ رکھتی ہے وہ اس نظامِ تعلیم میں جزوی اصلاحات کے لیے بھی کیوں آمادہ نہیں ہے؟ اور کیا وجہ ہے عالم اسلام ایسی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہے؟ اس مثال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذکورہ ملک کا تجربہ عالم اسلام کے لیے کوئی عالی معیاری اور مثالی نمونہ ہے، بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ تبدیلی کی خواہش، ارادہ اور عزم ہو تو ہر طرح کے مشکل حالات اور سخت سے سخت نظام میں بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا ہے۔ عالم اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جدیدیت کا مقابلہ کرنے کی بجائے اس سے مغلوب، مسحور اور مرعوب ہو گیا ہے، بلکہ وہ جدیدیت کے تمام مظاہر وآثار اسلامی تاریخ میں تلاش کر رہا ہے۔ جزئیات کی بنیاد پر کلیات اخذ کر کے مغربیت، جدیدیت اور لادینیت کی اسلامی تعبیریں پیش کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ لہٰذا عقل صرف ان امور میں استعمال کی جا رہی ہے جہاں اس کے استعمال کی ضرورت نہیں اور جہاں عقل کی ضرورت ہے وہاں مغرب کی کامل تقلید اختیار کر لی گئی ہے۔ مغرب کے فلسفے، اس کے علوم اور اس کے اداروں کا ناقدانہ جائزہ لینے کی بجائے ہم اسلامی علمیت، اس کے مکاتبِ فکر، ان کے اختلاف، اسلام کے اداروں، اس کی تاریخ کا ناقدانہ جائزہ لینے میں مصروف ہیں، لہٰذا مغرب محفوظ ہے اور اسلام مضروب، مجروح اور محبوس ہے۔ سرسید احمد خان عالم اسلام میں جدید تعلیم کے بانی ہیں۔ برصغیر

پاک و ہند میں سرسید نے دوسو سال پہلے جدید سیکولر تعلیم کا آغاز کیا، مگر اس وقت بھی انہیں یقین تھا کہ:

''جدید تعلیم کے نتیجے میں ہندو، مسلمان، عیسائی کے دل میں بھی مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی، ان کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جا رہا ہے۔ (حالی، حیات جاوید، ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز لاہور، ۱۹۸۴ء، طبع اول، ص: ۲۳۳، باب پنجم)

تیسرا خطرہ خاص کر مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا، جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی جس سے مفر نہ تھا، یہاں تک کہ سرسید کو خود ان میں یہ تعلیم پھیلانی پڑی، حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پریچنگ سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے۔ (حیات جاوید، دوسرا حصہ، ص: ۱۳۴، بحوالہ بالا)

لیکن سرسید کی رائے تھی کہ اس تعلیم کے بغیر ترقی ناممکن ہے، لہٰذا یہ ناگزیر برائی ہے، لہٰذا اس کی خرابیوں کا ازالہ ہونا چاہیے، مگر عالم اسلام کے ماہرین تعلیم اور اسکولوں کے منتظمین میں عموماً اس بات کا احساس نہیں ہے کہ جدید تعلیم کس طرح فکری ارتداد پیدا کرتی ہے اور اس کا ازالہ کیسے ہونا چاہیے۔

سرسید احمد خان نے جدید سیکولر مغربی تعلیم کے مذہب دشمن اثرات سے بچانے کے لیے قرآن کریم کی جدید تفسیر لکھی، جس کے نتیجے میں جدید نسل کی اصلاح تو کیا ہوتی، البتہ اسلامی علمیت کی بنیادیں منہدم ہوگئیں، لیکن سرسید کی فکرمندی ہمارے لیے قابل غور ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

''الغرض ان کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے ہونے کا اندیشہ ہے ان کا انسداد کیا جائے، اس مقصد کے لیے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔'' (حیات جاوید، ص: ۲۲۶)

اسلامی تاریخ میں علم کلام' دین پر ہونے والے حملوں کا دفاع کرتا اور عقائد دینی کو مستحکم طور پر ثابت کرنے کے لیے دلائل دینے اور اعتراضات وشبہات کا ازالہ کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ سرسید، چراغ علی اور شبلی نے جو علم کلام ایجاد کیا اس نے اسلامی علمیت پر ہونے والے تمام اعتراضات کو ہی قبول کرلیا، لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک نئے علم کلام کے لیے بھی کوئی محنت نہیں کی، بلکہ اس سیکولر نظام تعلیم کو ہم اپنا سمجھ کر قبول کر چکے ہیں، اس تقلید کے باعث ہم آج تک اس نظام کی تنقید تخلیق نہیں کر سکے۔

عجیب حکایت ہے کہ ایک انسان ایک شیر کے ساتھ کسی شہر کی سیر کر رہا تھا، سیر کرتے کرتے وہ ایک نمائش گاہ میں داخل ہوئے جہاں مصوری کے شاہکار رکھے ہوئے تھے، ایک شاہکار میں ایک شیر کو دکھایا گیا تھا جو زمین پر بے سدھ، بے یار و مددگار، حیران و پریشان، ہکا بکا، نیم جاں پڑا ہوا

تھا، شیر کی گردن پر ایک قوی ہیکل شکاری نہایت شان بلکہ تکبر کے ساتھ پیر رکھ کر مسکرا رہا تھا، اس کی کمر میں ایک بندوق بھی جھول رہی تھی۔ انسان نے شیر سے پوچھا: یہ تصویر کیسی ہے؟ شیر نے کمال بے نیازی سے تصویر کو دیکھا اور جواب دیا: ''یہ تصویر انسان نے بنائی ہے'' دوسرے معنوں میں یہ تصویر شیر نے نہیں بنائی، ورنہ صورت حال مختلف ہوتی۔ سوچنے کا یہ زاویہ زندگی، حرکت، حرارت اور تازگی کی علامت ہے۔ یہ زاویۂ نظر کسی لمحے بھی انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بدترین عذاب کسی قوم پر یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم فکر صحیح سے محروم ہو جائے، فکر صحیح ہو تو راکھ سے بھی نشیمن تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ ذرہ، صحراء، پتی، گل، گل، گلزار، اور دریچہ، دروازہ بن سکتا ہے۔

جدید سیکولر تعلیمی ادارے ہم نے نہیں بنائے، دنیا کی تئیس تہذیبوں میں اس طرح کے تعلیمی اداروں کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ دنیا کی تاریخ میں کبھی کوئی نظام تعلیم مادہ پرستی، شکم اور شہوت پرستی کی بنیاد پر تعمیر نہیں کیا گیا، ہر تعلیمی نظام کسی اعلیٰ ترین تصورِ خیر ''Meta Narrative'' کی فوقیت اور فروغ کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ تعلیم کا مقصد روٹی کمانا نہیں تھا، علم حقیقتِ مطلقہ ''Absolute Reality'' اللہ رب العزت کی معرفت تک پہنچنے کا ذریعہ تھا۔ مگر عصر حاضر میں تعلیم کا اصل مقصد آزادی، مساوات اور ترقی کا حصول ہے، لہٰذا علم وہ ہے جس سے مال و دولت کثرت سے حاصل ہوتے ہوں، لہٰذا ہر شخص حصولِ دولت کے لیے علم حاصل کرتا ہے۔ یہ محض دعویٰ نہیں ہے، اس کی دلیل بھی موجود ہے۔ اگر آج دنیا کی تمام حکومتیں اعلان کردیں کہ کسی سرکاری و غیر سرکاری یونیورسٹی سے سند لینے والے کو کسی ادارے میں ملازمت نہیں ملے گی تو تمام اسکول یونیورسٹیاں ویران ہو جائیں گی۔ یہ تعلیم علم کے لیے نہیں، روٹی کمانے کے لیے ہے، اس کا تعلق ''العلم'' سے نہیں، صرف عقلی علوم، سائنس، سوشل سائنس، آرٹ، کرافٹ اور فنون سے ہے، جسے دنیا کی تئیس تہذیبوں میں علم نہیں سمجھا جاتا تھا اور تجربی، سائنسی، حسی، عقلی علوم کو علوم کی تلچھٹ کہا جاتا تھا، اسی لیے سقراط، افلاطون اور ارسطو کے ہاتھوں سوفسطائیوں کو شکست ہوئی تھی، جو پیسے لے کر فنون بیچتے تھے اور اسے علم کہتے تھے، علم خرید و فرخت کی شئے نہیں ہے۔

بہت سے لوگ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اگر بچہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی سے علم حاصل کر کے پیسہ نہ کمائے تو کیا کرے؟ علم سے شعور، اعتماد، عزت، دولت، شہرت ملتی ہے تو اس کے حصول میں کیا حرج ہے؟ یہ دلیل بہ ظاہر مضبوط ہے، لیکن حقیقت میں کم زور ہے، کیونکہ اب دنیا میں پیسہ کمانے کے لیے علم نہیں کرتب بازی کی ضرورت ہے، مثلاً: فٹبال، کرکٹ، اسکواش کھیلنے والے جاہل کھلاڑی ارب پتی بن جاتے ہیں، فلم اور ٹی وی میں کام کرنے والے جاہل اینکر پرسن، پانسے پھینکنے والے سٹے باز ''Risk Managers'' جاہل صحافی، مسخرے بھانڈ، اداکار، کسبیاں، کھربوں روپے کماتے ہیں۔

جاہل سٹے باز، حجام، درزی جن کو اب فیشن ڈیزائنر کہتے ہیں، آرٹسٹ، فوٹو گرافر، مصور، ماڈل، رقاص اعلیٰ تعلیم کے بغیر اتنا دھن کماتے ہیں کہ انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا، عزت اسی کو ملتی ہے جو مال و دولت میں سب سے آگے ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ علم سے دولت ملتی ہے، جدیدیت اور مغربیت سے ہماری ناواقفیت کا عمل ہے۔ کینیڈا میں ٹرک ڈرائیور ڈاکٹر سے زیادہ پیسے کماتا ہے۔ برطانیہ میں تندور پر روٹی لگانے والے کی تنخواہ ڈاکٹر سے زیادہ ہے۔

ٹنڈو جام یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر نے جنگ کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کا بیٹا حجام بننا چاہتا ہے، صحافی کو حیرت ہوئی تو جواب ملا جن دنوں میں امریکہ میں مقیم تھا، ہمارے محلے میں ایک حجام تھا جس سے ہم بال کٹواتے تھے، اس کی آمدنی مجھ سے کئی گنا زیادہ تھی، تو بیٹے نے کہا کہ ابو آپ سے بہتر تو یہ حجام ہے جو اتنا کما لیتا ہے۔ جب تہذیب کا نقطۂ کمال مال کی فراوانی اور تعیش کی ارزانی ہو تو یہ تصورِ خیر ایک نئے انسان کی تعمیر کرتا ہے، جسے ہم جدید انسان ''Modren Man'' کہتے ہیں۔ جدید تعلیمی اداروں سے ایسے ہی لوگ نکلتے ہیں۔

جاہل سیاست دان بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور راتوں رات کروڑ پتی، ارب پتی، پھر چند سالوں میں کھرب پتی ہو جاتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا صرف پاکستان اور تیسری دنیا کے ممالک میں ہوتا ہے، لیکن دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت امریکہ اور بھارت میں بھی یہی ہوتا ہے۔ ریگن ہالی ووڈ کا ایک اداکار امریکہ کا صدر بن سکتا ہے اور واجپائی، مودی جیسے جاہل بھارت کے وزیراعظم بن جاتے ہیں۔ جمہوریت میں ایسا ہی ہوتا ہے، پوری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے نیوز ویک کے سابق مدیر اور صدر بش کی کچن کیبنٹ کے رکن فرید زکریا کی کتاب ''The Future of Freedom'' پڑھیے۔ دنیا بھر کی جمہوریتوں کے جاہل سیاستدانوں کی تاریخ آپ کو مل جائے گی۔ فرید زکریا نے لکھا ہے کہ امریکہ میں ۸۵ فی صد فیصلے کانگریس اور سینٹ میں عوام کے نمائندے نہیں کرتے، بلکہ لابیاں، پریشر گروپ اور مختلف گروہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے الیکشن جیتنے اور ہارنے کے لیے کھربوں روپے کی امداد دینے والے اپنے مفادات کیوں حاصل نہ کریں۔ تعلیم، سیاست، علم، سب کا ایک ہی مقصد ہے: ''سرمایہ میں اضافہ'' جس سے ''آزادی'' میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی عہد حاضر کا مذہب ہے، اسے سرمایہ دارانہ نظام بھی کہتے ہیں۔

جدید اسکول ہمیں وہ سانچے مہیا کرتے ہیں جس کے ذریعے ہم استعمار کی غلامی قبول کرتے اور اس کے پیدا کردہ مقاصد زندگی کو ''الحق'' سمجھتے ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے مغرب کے مقابلے پر ہماری سیاسی، عسکری شکست کو تہذیبی شکست میں بدلتے ہیں اور نوکری اور ترقی کو زندگی کا اصل مقصد بنا کر انسان

کی تخلیقی صلاحیتوں کو مسلسل و مکمل رہنمائی اور بھاری بھرکم نصاب کے ذریعے کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ سوچنے، جانچنے، پرکھنے کے تمام فطری پیمانوں کو توڑ کر صرف ایک طریقے سے سوچنا سکھاتے ہیں۔ مارکوزے کے الفاظ میں یک رخا آدمی ''One Dimensional Man'' پیدا کرتے ہیں جو صرف مغرب سے ہی وفادار رہ سکتا ہے۔ دوسرے معنوں میں ان اسکولوں سے نکلنے والی نسل کے لیے دین کے سوا زندگی کے تمام شعبوں میں عقل کا استعمال ممنوع و حرام ہو جاتا ہے۔ عقل صرف دین پر تنقید اور دین کی جدید تعبیر کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ نظام تعلیم و تربیت اتنا مہلک ہے کہ جہاں عقل استعمال کرنی چاہیے وہاں دین کو لے آتے ہیں، جہاں دین، روایت، نقل، وحی پر اعتماد کرنا چاہیے وہاں عقل لے آتے ہیں۔ لہٰذا جدید تعلیمی نظام سے جو خلق جدید برآمد ہوتی ہے وہ مذہب اور اسلام پر ہونے والے کسی اعتراض کا جواب دینے کے قابل نہیں ہوتی اور ہر اعتراض کو حقیقت سمجھ کر قبول کرتی اور اپنی تاریخ اور تہذیب سے دستبردار ہو جاتی ہے۔

جدید دور میں سب سے زیادہ آمدنی ''Incom'' سٹے باز ''Risk Manager'' کی ہوتی ہے، اس کے پاس صرف قیاس، گمان، ظن، تخمین کا علم ہوتا ہے، اس کے پاس ایک خاص حس، جذبہ، حوصلہ اور ولولہ ہوتا ہے جس کا علم اور سند کسی تعلیمی ادارے سے نہیں ملتی، دنیا کا سب سے بڑا سٹہ باز جارج سوروس ''J.Soros'' بس اندازے پر کھیلتا ہے، وہ کھرب پتی ہے۔ اس نے ملائیشیا کی معیشت کو اسٹاک مارکیٹ کے ذریعہ تباہ کر کے ایشین ٹائیگر کو ایک رات میں پیپر ٹائیگر بنا دیا تھا۔ اس عالمی سٹے باز کی بے پناہ آمدنی اور علم سے متعلق تفصیلات کے لیے نائیل فرگوسن کی کتاب ''The Ascent of money'' پڑھ لیجیے۔

جدیدیت ''Modrenism'' لادینیت ''Secularism'' اور سرمایہ داری و جمہوریت ''Capitalism & Democracy'' کی پیدا کردہ جدید دنیا میں شہرت، عزت اور دولت کا معیار علم نہیں ہے، بلکہ سائنسی علم بھی نہیں، بلکہ علم کا معیار یہ ہے کہ کون اپنے کام، فن سے سب سے زیادہ سرمایہ پیدا کر سکتا ہے، کیونکہ آزادی صرف سرمایہ سے حاصل ہوتی ہے، اسی لیے مغرب میں کام ''Work'' کی تعریف یہ ہے کہ جس سے سرمایہ حاصل ہو۔ کام کا نہ ہونا پاگل پن ہے، یعنی جو شخص کام نہیں کرتا، سرمایہ نہیں کماتا، وہ اپنی آزادی کا انکار کرتا ہے۔ ''آزادی'' مغرب کا بنیادی ایمان و عقیدہ ہے، لہٰذا آزادی اور سرمایہ کا منکر پاگل ہے۔ فوکالٹ لکھتا ہے: ''The absence of work is madness'' اسی لیے گھر میں تیرہ بچوں کو پالنے والی عورت کے کام کو مغرب کام تسلیم نہیں کرتا کہ اس سے سرمایہ نہیں پیدا ہوتا۔ یہ عورت باہر جائے، کمائے تو اُسے ''Working Woman'' کہتے ہیں۔ بدکار عورت اپنی ملکیتِ جسم کو بیچ کر سرمایہ کما کر اپنی آزادی میں اضافہ کرتی ہے، لہٰذا اُسے طوائف نہیں ''Sex Worker'' کہتے ہیں، یعنی محنت کے ذریعے آزادی اور سرمایہ جیسے عظیم کام انجام دینے والی عورت۔ جدید سیاسی فلسفے

کا سب سے بڑا مفکر جان رالز جس کی کتاب ''Theory Of Justice'' جدید ریاستوں میں عدل کے موضوع پر انجیل سمجھی جاتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ ہر انسان کو چار بنیادی خیر ''Four Primary Goods'' حاصل ہونے چاہئیں: آمدنی، دولت، قوت اور اقتدار ''Incom/ Wealth/ Power/ Authority'' ان چار بنیادی خیروں کے بعد ہی کوئی شخص اپنی آنکھوں میں عزت و تکریم ''Self Respect'' کے قابل ہو سکتا ہے۔ دوسرے معنوں میں کوئی شخص اپنی نگاہ میں بھی ان چار بنیادی اسباب کے بغیر عزت کے قابل نہیں۔ جس شخص کو اپنی نگاہوں میں ان چار عقائد کے بغیر عزت حاصل نہیں اسے دوسرے کی نگاہوں میں عزت کیسے مل سکتی ہے؟ جدید نظام تعلیم ہمیں یہی عزت دلانے کا فریضہ انجام دیتا ہے کہ عزت کے پیمانے تبدیل ہو چکے ہیں، دوسرے معنوں میں ہمارے عقیدے، ایمانیات اور ما بعد الطبیعیات بھی بدل چکے ہیں، لہٰذا جس کے پاس مال و دولت اور اسباب کی فراوانی نہیں ہے وہ عزت کے قابل ہی نہیں ہے۔ افسوس کہ دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے لوگ اس پیمانے پر پورا نہیں اترتے۔

دنیا بھر میں عموماً اور عالم اسلام میں خصوصاً سائنس کو برتر علم جانا جاتا ہے، لیکن سائنس دان ''Scientists'' کی مغرب میں اتنی عزت نہیں کی جاتی، جتنی عزت سٹے باز ''Risk Managers'' رنڈیوں، مراثیوں، بھانڈوں ''Showbuisness Stars'' اور کھلاڑیوں ''Sports Men'' کی ہوتی ہے۔ عزت کا پیمانہ مغرب اور دنیائے جدید ''Modren Age'' میں صرف مادی ہے اور وہ ہے پیسہ۔ جو زیادہ کماتا ہے وہ زیادہ عزت پاتا ہے۔ سب سے زیادہ پیسہ سٹے باز کماتے ہیں، اس کے بعد رنڈیاں اور کھلاڑی وغیرہ، اس کے بعد سائنس دانوں کا نمبر آتا ہے، کیونکہ سٹے باز اور رنڈیاں سرمایہ کی پیداوار میں سائنس دانوں سے زیادہ بہتر ہیں، مثلاً: عالمی اولمپکس کے ایک ہفتے کے کھیل سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے، امریکہ کی تمام یونیورسٹیاں سال بھر میں اتنا سرمایہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ صرف امریکہ میں عریانی فحاشی کی صنعت ایک سال میں جتنا سرمایہ پیدا کرتی ہے، دنیا کی کئی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں (جن میں مائیکرو سافٹ جیسی کمپنی بھی شامل ہے) اجتماعی طور پر بھی اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرتیں، کرس ہیجز کی کتاب دیکھ لیجیے:

World wide porn revenues topped 97 billion Dollar in 2006. That is more than the revenues of Microsoft, Google. Amazon, e Bay, Yahoo, Apple, Net flix & Earth link combined. [Chris Hedges., Empire of illusion : The end of literacy & the triumph of spectalce Nation Books USA 2009, p. 58]

لہٰذا زیادہ اجرت ''Salaries'' اُسے ملے گی جو زیادہ سرمایہ پیدا کرے گا۔ برکلے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی تنخواہ یونیورسٹی کے فٹبال کوچ سے کم ہے، فٹبال کوچ سالانہ تین ملین ڈالر کماتا ہے اور

وائس چانسلر تین لاکھ ڈالر بھی نہیں کماتا۔ ایک فٹبال میچ سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے بڑے بڑے اتنا سرمایہ کئی سالوں میں نہیں پیدا کرسکتی۔ کرس ہیجز اپنی کتاب ''The Impire Of illusion'' میں لکھتا ہے:

The football coach is Berkeley's highest paid employee. He makes about 3 million dollar. [p. 94]

کرس ہیجز اسی کتاب کے باب ''illusion Of Love'' میں لکھتا ہے کہ امریکہ میں ایک اعلیٰ ترین رنڈی تین ہزار ڈالر فی گھنٹہ کماتی ہے۔ آج کل اُسے آرٹسٹ، فلم اسٹار، فلمی ستارہ Sex Worker کہا جاتا ہے، لیکن اس پیشے کے عیوب ظاہر کرنے کے لیے سب سے بہترین لفظ یہی ہے۔

The porn stars make anywhere from 1500 dollar to 3000 dollar an hour as prostitute. [p. 68, ibid]

اگر یہ رنڈی روزانہ بارہ گھنٹے کام کرے تو اس کی روزانہ کی آمدنی ۳۶ ہزار ڈالر ہے جو ایک امریکی استاد کی سالانہ آمدنی ہے۔ یہ رنڈی ماہانہ دس لاکھ اسی ہزار ڈالر کماتی ہے، جبکہ امریکی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ایک سال میں صرف دو لاکھ سترہ ہزار چار سو ڈالر کماتا ہے۔ رنڈی کا لفظ اب متروک ہوگیا ہے، کیونکہ معاشرے میں گناہ اور گناہ گار کو پسند کیا جارہا ہے۔ اُسے برداشت ''Tolerance'' کہتے ہیں۔ یہ آزادی کے عقیدے کا نتیجہ ہے کہ ہر پھول کو کھلنے دو۔ آپ نیک کام کریں، دوسرے کو برے کام کرنے دیں، دونوں کا حق ہے۔ عہد حاضر حق ''Right'' کے منہاج کا عہد ہے، آپ جو چاہے کریں کہ حق ''Good'' کچھ نہیں ہوتا، یہ ہر شخص کا محض دعویٰ ہوتا ہے۔ ہر شخص کو حق ''Right'' ہے کہ جسے خیر ''Good'' سمجھے، اپنی ذاتی زندگی میں اُسے خود اختیار کرے، دوسرے کو اختیار کرنے پر مجبور نہ کرے۔ اپنی مرضی، آزادی اور اختیار مطلق سے آپ جس خیر کو اختیار کرنا چاہیں کرسکتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں خیر کی بحث بے معنی ہے، خیر کچھ نہیں ہوتا، اصل چیز پیسہ ہے، بس پیسے کماؤ، جدید نظام تعلیم اور تعلیمی اداروں کا یہی مقصد ہے۔

حسین نصر نے بھی یہ بات لکھی ہے کہ مغرب میں اسپورٹس ہیرو کی ایک سال کی آمدنی ایک بہت بڑے سائنس داں اور عظیم مفکر کی پوری زندگی کی آمدنی سے زیادہ ہوتی ہے:

There are now sports heroes who make more of a salary in one year than the greatest westren scientists or scholars will do in his or her life time. [S. H. Nasr: A Young Muslim's guide to the modern world, Suhail Academy Lahore, 1988, p.232]

مشہور فلسفی مائیکل سانڈل لکھتا ہے کہ امریکہ میں اسکول کا ایک عام استاد ایک سال میں ۴۳ ہزار ڈالر کماتا ہے، لیکن ڈیوڈ لیٹر مین جو رات گئے فحش گوئی کے پروگرام کی میزبانی کرتا ہے، اس کی سالانہ آمدنی اکتیس ملین ڈالر ہے۔ امریکہ کا سب سے عاقل اہم ترین آدمی سپریم کورٹ کا

چیف جسٹس ایک سال میں صرف دو لاکھ سترہ ہزار چار سو ڈالر کماتا ہے اور ایک ٹیلی ویژن شو کی جج جو ڈی ایک سال میں ۲۵ ملین ڈالر کما لیتی ہے:

☆The average schoolteacher in the United States makes about $43,000 per year. David Letterman, the late-night talk show host, earns $31 million a year.

☆John Roberts, chief justice of the U.S. Supreme Court, is paid $217,400 a year. Judge Judy, who has a reality television show, makes $25 million a year. [Justice, What's The Right Thing To Do?, Michael J. Sandel ,p.162]

اس صورت حال میں بچے اسکول جانا پسند کریں گے یا وہ کام کرنا پسند کریں گے جس کے حصول کے لیے صبح سے رات تک پڑھنے، لکھنے اور سر کھپانے کی ضرورت نہیں، جس سے ان کی آمدنی بے پناہ ہو جائے۔

اسلامی اسکولوں میں جب آپ بچے کو اسلام، آخرت اور بہترین آمدنی، بہترین معیار زندگی، بہترین دنیا یعنی دو مختلف تصوراتِ خیر کی طرف بلاتے ہیں تو بچہ کون سا تصورِ خیر اختیار کرے گا؟ اگر آج کی نسل معیار زندگی بلند کرنے کے لیے غیر اخلاقی پیشوں کو بے تابانہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو اس کا سبب ہمارے غلط نظریات ہیں۔ ہر تہذیب میں تصورِ خیر ''Concept of Good'' صرف ایک ہوتا ہے، اسلامی تہذیب کا تصورِ خیر ''التوحید'' ہے، مغرب کا تصورِ خیر ''آزادی'' ہے، جس کی دو شکلیں ہیں، ایک تجریدی ''Abstract'' یعنی ووٹ ''Vote'' دوسری ٹھوس ''Concrete'' وہ ہے سرمایہ ''Capital'' سرمایے کے بغیر آزادی کا حصول ممکن نہیں اور جدید نظام تعلیم اور اس کے قائم کردہ ادارے سرمایہ داری کے لیے شاہ دول کے چوہے ''Corporate Slaves'' پیدا کرتے ہیں، یہ غلام سرمایہ، عیاشی، آزادی کے سوا کچھ اور سوچنے کچھ اور کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ جس طرح دریا کا پانی بہہ کر سمندر کی طرف جاتا ہے، جس طرح کچھوے کا بچہ اس زمین پر آنکھ کھولتے ہی سمندر کا رخ کرتا ہے، اسی طرح جدید نسل تعلیم کے بحر سے باہر نکلتے ہی دنیا پرستی اور عیش پرستی کی طرف دوڑتی ہے۔

تصورِ خیر کی بحث بنیادی بحث ہے، خیر ''Good'' اس پیمانے کو کہتے ہیں جس پر ہر شئے کو پرکھا جاسکے، لہٰذا پیمانہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے، پیمانے کبھی دو نہیں ہو سکتے۔ جب ہم دین اور دنیا کو برابر سمجھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ A=B دوسرے معنوں میں B=A، بنیادی سوال یہ ہے کہ دین کو دنیا کے پیمانے پر پرکھا جائے گا یا دنیا کو دین کے پیمانے پر پرکھا جائے گا؟ اگر دونوں برابر ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کو دنیا کے پیمانے پر پرکھنا بالکل درست ہے، لہٰذا عصر حاضر میں دین وہی ہے جو دنیا کے پیمانے پر پورا

اترے۔ سرسید اور شبلی کے الفاظ میں سچا دین وہ ہے جو جدید تہذیب وتمدن اور زمانے کی ترقی کا ساتھ دے سکے۔ تفصیلات کے لیے حالی کی ''حیاتِ جاوید'' ضیاء الدین لاہوری کی ''افکارِ سرسید'' شبلی نعمانی کی ''علم کلام اور الکلام'' اور سید سلیمان ندویؒ کی ''حیات شبلی'' کا مطالعہ کیجیے۔ دوسرے معنوں میں ہم دین کے مطابق ڈھلنا نہیں چاہتے، بلکہ دین کو اپنے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ ہم قرآن وسنت کے مقلد نہیں، شریعت ہماری مقلد ہے، شریعت حاکم نہیں، ہمارا نفس حاکم ہے۔

چونکہ دین اس امتحان میں ناکام ہے، وہ دنیا پرستی، مادّہ پرستی ''Materialism'' اور مادہ پرستی ''Women Worship'' اور عیش پرستی کی دلیلیں مہیا کرنے سے قاصر ہے، لہٰذا دین کی تشکیل جدید، تعبیر نو، تعمیر نو، بلکہ تخریب نو ''Re Construction Of Religious Thought'' کا کام زور وشور سے جاری ہے۔ (جاری ہے)

ماہنامہ بینات کے اجراء کا طریقہ

1:..... جو حضرات ''ماہنامہ بینات'' کے دفتر تشریف لا سکتے ہوں، وہ ''ماہنامہ بینات'' کے دفتر آ کر اپنا مکمل پتہ اور فون نمبر درج کرانے کے ساتھ مبلغ 350 روپے سالانہ فیس جمع کرائیں۔

2:..... جو حضرات کسی بنا پر دفتر بینات نہ آ سکتے ہوں تو وہ اپنے مکمل پتہ کے ساتھ 350 روپے کا منی آرڈر ناظم دفتر بینات کے نام بھیج دیں اور منی آرڈر کے آخر میں یہ وضاحت ضرور فرمائیں کہ یہ رقم ماہنامہ بینات کے اجراء کے لیے ہے۔

3:..... یا ''ماہنامہ بینات'' کے بینک اکاؤنٹ میں 350 روپے جمع کروا کر بینک سے ملنے والی رسید اسکین کر کے اپنے نام، مکمل پتہ اور فون نمبر کے ساتھ ''ماہنامہ بینات'' کے ای میل ایڈریس پر میل کر دیں۔

نوٹ: پرانے خریدار بھی مذکورہ طریقوں سے سالانہ فیس جمع کرا سکتے ہیں، مگر ان کے لیے اپنے خریداری نمبر کی وضاحت ضروری ہے۔

فون دفتر بینات: 021-34927233 ای میل ایڈریس: bayyinat@banuri.edu.pk

بینک اکاؤنٹ نمبر: مسلم کمرشل بینک بنوری ٹاؤن برانچ کراچی، برانچ کوڈ: 0816 اکاؤنٹ نمبر: 101900-397-7

ڈاک کا پتہ: دفتر ''ماہنامہ بینات'' جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، جمشید روڈ کراچی نمبر 5